تیل اور تخلیق کے تناظر میں ن م راشد کی نظموں کی نئی معنویت

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل (ایسو سی ایٹ پروفیسر، ڈویژن آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور)
ڈاکٹر شیر علی (صدر شعبہ اُردو، الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان)

ABSTRACT:

Since time immemorial, clash over possession and exploitation of agricultural land and material resources has dogged all humanity. Earlier it was quest for land that defined warfare and oppression. From late 19th century onwards, urge has been to be able to exploit material resources, wherever they are at the cost of original owners. A case in point is the quiet recent tug of war between Venezuela and the United States. Ostensibly dubbed as a conflict over spread of democracy, in reality, the struggle is more mundane. It is for control of oil resources of Venezuela. Same is true in case of countries with huge oil and gas reserves particularly Islamic countries of the Middle East.

N. M. Rashid is decidedly a major voice in modern Urdu poetry. Enthused with newer sensibilities, Rashid gives voice in his poetry to political and social concerns that informed poetry and other artistic expressions not only in the Islamic world, but throughout the world, crippled by colonial shackles, could do precious little but to endure indignity of both slavery and rapacious economic exploitation. Rashid being a poet, could foresee that Nature had given Persians another chance to stamp their cultural authority like they did eons ago and developed Samarkand and Bukhara as symbols of learning, cultural sophistication and national pride. Now, Rashid says in his poem ‘Tael ke Soudagar ‘or ‘Oil Merchants ‘this is the time to develop new centers like Tehran and Mashhad as centers of intellectual learning and excellence. This learning should be based on modern concepts and should address modern concerns. He further warns the Persians that given their resources, carpet beggars would come with promises of an easy and happy life, but they better not be trusted. Rashid cites here Indian experience with East India Company and signs a warning to his readers that they should not let history repeat itself. In this article, Rashid’s poem ‘Tael ke Soudagar ‘has been chosen as a metaphor of

modern sensibility as well as deep socio – economic consciousness. Rashid as a consummate artist as well as a deep preceptor of what lies in future oozes out in this poem.

کلیدی الفاظ:۔ن م راشد، تیل کے سوداگر، تیل کی سیاست، عالمی منظر نامہ، تاریخی تناظر، ایران، تعارف، نئے انسان کی ماجرائیت، دوسری عالمی جنگ،

ن۔م۔راشد کی پیدایش ۱۹۱۰ء کو مغربی پاکستان کے شہر گوجرانوالہ کے ایک نسبتاً کم معروف قصبہ اکال گڑھ میں ہوئی تھی اور اُن کی وفات ۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو برطانیہ کے شہر چلٹنم میں ہوئی تھی(۱) راشد نے نظم کے کلاسیکی پیٹرن اور آہنگ سے ہٹ کر ایک الگ اور جُداگانہ اُسلوب اور طرز کی آزاد نظم کو اپنے مافی الضمیر کے لیے وسیلۂ اظہار کے طور سے اپنایا تھا۔اپنے آغازِ شاعری میں اُنھوں ایک درجن کے قریب غزلیات بھی تخلیق کیں مگر وہ روایتی مضامین اور اُسلوب کی حامل ہیں۔بعد میں اُنھوں نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے آزاد نظم کا پیٹرن اور آہنگ اختیار کیا جو آگے چل کر اُن کی ایک بھرپور نوعیت کی حامل پہچان اور انفرادیت کا وسیلہ اور ضامن بھی قرار پایا۔راشد کے موضوعات بڑے ہیں، اُن کی نظموں میں موضوعاتی پھیلاؤ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ وہ ایک وسیع فکر رکھنے والے شاعر ہیں۔اُن کی نظموں میں تکنیک تو آزاد نظم ہی کی بروئے کار لائی گئی ہے مگر موضوعات کا پھیلاؤ اُن کی وسعتِ نظر اور وسیع المطالعہ ہونے پر دال ہے۔اُنھوں نے برٹش کولونیل دور کی استعماریت کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے اور استعمارہ زدہ لوگوں کی داخلی، معاشرتی اور بیرونی شکست و ریخت کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے اور پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے نتیجے میں اقتصادی بدحالی بھی اُن کی نظموں کا سرنامہ بنی ہے۔اُن کی نظموں میں زندگی کے کئی ایک پہلو اور کئی ایک جہتیں آشکار ہوئی ہیں۔

"تیل کے سوداگر" پر تفصیل کے ساتھ تجزیہ کرنے سے پہلے اِس نظم کے اور اُس دور کے سیاق و سباق کو بھی دیکھنا ضروری ہے۔ن م راشد کا عہد وہ ہے، جہاں تیل دریافت ہو چکا تھا۔ایران میں ۱۹۰۸ء میں برطانیہ کی اینگلو پرشیئن کمپنی نے تیل نکالنے کا کام شروع کر دیا تھا اور جدید زندگی کے پہیے کو رواں دواں رکھنے کے لیے تیل کی ایک بڑی کلیدی اہمیت ہو چلی تھی۔برطانیہ میں ۱۷۶۰ء کے لگ بھگ انڈسٹری لگائی جا چکی تھی اور دیگر مغربی ممالک کے ساتھ ساتھ برطانیہ کو بھی تیل کی اہمیت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ تیل کا استعمال صنعتوں، گاڑیوں، بحری جہازوں، آب دوزوں اور بہت ساری دیگر چیزوں میں ہونا ناگزیر ہونے لگا تھا اور روشنی کے لیے بھی تیل کے استعمال کی اہمیت ایک حقیقت کا رُوپ دھار چکی

تھی۔اِس طریقے سے زندگی میں ایک بڑی تبدیلی نظر آرہی تھی۔اِس طرح انسانی تاریخ میں ایندھن کے ایک بہت بڑے عامل کے طور پر بھی تیل ایک معدنی دولت کے طور پر سامنے آتا ہے۔

تیل کی تجارت یا سوداگری کے حوالے سے دو تین باتیں سمجھنے والی ہیں۔ایک تو یہ کہ جن خطوں میں تیل دریافت ہوا،اُس دور میں وہ خطے جہاں تیل دریافت ہوا تھا،اُن علاقوں اور خطوں میں تیل کے صارف بہت محدود سطح پر تھے۔اُس دور میں کئی ایک لحاظ سے وہ تیل اُن کے کسی کام کا نہیں تھا۔وہ اِس لیے کہ اُن کے پاس صنعت بھی نہیں تھی اور نہ اُن کے پاس گاڑیوں کا اژدحام تھا،نہ اُن کے پاس گھروں کو تیل کے ذریعے گرم کرنے کا انتظام تھا اور نہ اُن کے ہاں تیل کے دوسرے استعمالات تھے،یعنی وہ سرزمین تیل پیدا کرنے والی تھی،لیکن تیل کا استعمال کہیں اور ہو رہا تھا۔پھر دوسرا یہ کہ تیل جن زمینوں سے نکلتا تھا،وہ سعودی عرب ہو،کویت ہو،عراق ہو یا مشرقِ وسطیٰ کے اور ممالک ہوں،چوں کہ ابتدائی تیل کے ذخائر وہیں دریافت ہوئے تھے۔جب تیل دریافت ہوا تو اُن کی معیشت،اُن کی صنعت اور اُن کی تجارت اُس دور میں ابھی بہت ہی نوخیز تھی بلکہ بڑی حد تک پسماندگی کی حالت میں تھی اور تیل کی دریافت سے اچانک اُن کے ہاں ایک خوش حالی کی لہر دوڑ آئی، لیکن وہ خوش حالی علمی بنیاد یا کوئی تجارتی بنیاد یا کوئی صنعتی بنیاد قائم کرنے سے قاصر رہی بلکہ یہ کہ وہاں کے جو حکمران طبقے تھے،اُن کے لیے ایک عیاشی کا سامان لے کر آئی۔تیسرے یہ کہ تیل کی دریافت کے عمل سے لے کے،تیل کے کنوؤں کی کُھدائی سے لے کے تیل کو پمپ آؤٹ کرنے،تیل کی سپلائی اور تیل کی سپلائی لائن بچھانے اور اُس کی بحری جہازوں کے ذریعے یورپ،امریکہ اور دُنیا کے باقی ملکوں تک تیل پہنچانے تک اور پھر اُس تیل کو ریفائن کرنے کا کام بالکل سامنے کا مظہر تھا اور اُس تیل کے اُوپر ساری کی ساری اجارہ داری یورپین اور امریکی سوداگروں اور کمپنیوں کی قائم ہو گئی تھی اور اب بھی بڑی حد تک اُنھی کمپنیوں کی تیل پر اجارہ داری قائم ودائم ہے۔جب سعودی عرب میں تیل دریافت ہوا تو اُس میں عربوں کا اُس تیل کو ڈھونڈ نکالنے میں کوئی کمال نہیں تھا۔اُس کے لیے ابتدائی تلاش کا کام بھی برطانیہ اور یورپ اور امریکہ کی کمپنیوں نے کیا،اور جب ذخائر کنفرم ہو گئے کہ زیرِ زمین یہاں تیل ہے تو اُس کے کنوؤں کی کُھدائی اور اُس تیل کو صاف کرنے کے لیے ریفائنری اور اُس تیل کو کنویں سے بندرگاہ تک پہنچانے اور بندرگاہ سے بڑے ٹینکروں کے ذریعے دُنیا کے دوسرے ممالک تک پہنچانے کا،یہ سارے کا سارا جو نظم و نسق تھا،یہ سارے کا سارے کام یورپی اور امریکی کمپنیوں اور اُن کے مالکان کے پاس تھا،اِس طرح تیل کے تمام معاملات پر اُن کا (مغربی کمپنیوں) کنڑول میں تھا،اُن کا سارا نظام اُن کے ہاتھ میں تھا۔تیل کے نئے کنوؤں کی کھوج اور تیل کے نئے ذخائر کی تلاش اور پُرانے کنوؤں کی مرمت و بحالی کا کام، تیل کی

ریفائنری، تیل کی شپ منٹ اور تیل کی ٹرانسپورٹیشن کا سارا کام اور سارے کا سارا انتظام اِس لیے بھی اُن کے پاس تھا کہ اُن کے پاس مشینری، ٹیکنولوجی اور وسائل بھی تھے تو اِس طرح کی صورتِ حال نے عالمی تجارت میں ایک بہت بڑے عامل کو جنم دیا اور وہ عامل تیل کی تجارت تھا۔ اب اُس عامل میں جو تیل پیدا کرنے والے ممالک ہیں، ایک تو یہ ہے کہ اُن ممالک میں تیل کا استعمال برائے نام ہے اور دوسرے یہ ہے کہ وہ اُس کو خود کسی تصرف میں لانے کے لائق نہیں تھے اور نہ وہ اُس کے کنوؤں کی کُھدائی کر سکتے تھے۔ اُن ممالک کے پاس نہ وہ مشینری ہے اور نہ وہ ٹیکنولوجی تھی اور نہ وہ علم تھا اور اُن ممالک کے پاس جہاں سے تیل نکل رہا تھا، وسائل بھی نہیں تھے تو ایسی صورتِ حال نے عالمی تجارت اور صنعت میں ایک نئے عامل کو جنم دیا اور وہ یہ تھا کہ تیل کی تجارت کے ذریعے عالمی سیاست اور عالمی معیشت پر مغربی غلبے کی خواہش اور باقاعدہ کنڑول جو ایک نو سامراجیت کا ایک بڑا ٹُول (Tool) تھا۔ اب یہاں تیل کی تجارت اور جو سودا گری ہے اور اُس میں جو اجارہ داری ہے اور اُس اجارہ داری میں جس زمین سے تیل نکلتا ہے، اُس کا حصہ برائے نام تھا یا ہے۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک کو رائلٹی (Royalty) برائے نام دی جاتی ہے اور اسی طرح کی کئی ایک دیگر بد معاملگیاں ہیں اور جو مشرقِ وسطیٰ کی معدنی دولت ہے، اُس کا جو فائدہ ہے اور اُس سے منسلک جو حقیقی خوش حالی ہے، وہ بھی یورپ اور امریکہ کی اور سامراجی قوتوں کی ہی ہو رہی ہے۔ ن م راشد ایران میں بہت عرصے تک مقیم رہے تو محض اُنھوں نے مطالعے کی بنیاد پر نہیں، چوں کہ ایران ایک خود تیل پیدا کرنے والا ملک تھا تو راشد نے تیل کے سوداگروں کو اور تیل کی جو عالمی ملٹائی نیشنل کمپنیاں تھیں یا ہیں، اُن کے مختلف ہتھکنڈوں کو خود اپنی نظروں سے دیکھا اور اس کے نتیجے میں اُنھیں یہ احساس ہوا کہ یہ تو لوٹ کھسوٹ اور بڑے پیمانے پر استحصال کا اہلِ مغرب کے پاس اور امریکہ کے پاس ایک نیا ہتھیار آ گیا ہے اور وہ اپنی ٹیکنولوجی اور اپنے مادّی وسائل کی بنیاد پر جہاں سے تیل نکالتے ہیں، اُس سے فائدہ تو وہ بہت اُٹھا رہے ہیں، اور وہ منافع بھی بہت کما رہے ہیں، لیکن تیل کی سرزمین کو حقیقی فائدہ اِس لیے نہیں ہو رہا کہ وہاں پر اُنھوں نے خود اِس طرح کے حکمران مسلط کیے ہوئے ہیں، جن کی حیثیت یورپ اور امریکہ کے ٹوڈی کی ہے اور وہ اپنے اقتدار کے لیے اور اپنی بقا اور حفاظت کے لیے اُنھی یورپی اور امریکی سامراجی آقاؤں کی خوشنودی پر انحصار کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ راشد جیسا آدمی جو مشرق کی عظمت کا قائل ہے۔ راشد جیسا تخلیق کار جو اپنی روح میں روحِ شرق لیے پھرتا ہے، اور راشد جیسا آدمی جو اندر سے اس سارے استحصالی نظام سے برات کا اعلان بھی کرتا ہے اور اُس استحصالی نظام سے دُکھی بھی ہے تو جب وہ اِس کو اپنی شاعری کا وظیفہ اور موضوع بناتے ہیں تو وہ پہلے مشرق کے جو بڑے تمدنی، ثقافتی اور

تہذیبی سِمبلز (علامات) ہیں، اُن کو اُستوار کرتے ہیں اور اُن کی بازیافت کرتے ہیں اور اُس میں جو تہذیبی و تمدنی جو سِمبلز ہیں۔ وہ سمرقند اور بخارا ہیں۔ عہدِ وسطیٰ میں جب سامراجیت نے کئی ایک لحاظ سے اپنے پَر نہیں پھیلائے تھے اور قرونِ وسطیٰ کے دور (Medieval Age) میں جب بادشاہتیں اور سلطنتیں ہوتی تھیں، اُس دور میں سمرقند اور بخارا دو بہت بڑے تمدنی مراکز تھے۔ اُن مراکز میں خوش حالی بھی تھی اور سیاسی اعتبار سے بالیدگی بھی تھی، تہذیبی و تمدنی اور ثقافتی اعتبار سے سمرقند اور بخارا کو دو بڑے مراکز کا درجہ حاصل تھا اور وہ تہذیبی و تمدنی ورثے کے بھی حامل ہونے کے اعتبار سے بہت بڑے مراکز تھے۔ سمرقند اور بخارا سے باہر بھی پورے مشرق میں سمرقند اور بخارا کی خوش حالی اور اُن کے عظمت کے گُن گائے جاتے تھے اور ہماری شاعری میں بلخ اور بخارا کے اور سمرقند و بخارا کے نغمے گائے گئے ہیں۔ سمرقند اور بخارا کی شان و شوکت کو سراہا جاتا رہا ہے، اور پھر یہ کہ صدیوں تک سمرقند اور بخارا مشرق کی عظمت کی علامتوں کے طور پر برقرار رہے۔ پھر جیسا کہ ہوتا ہے، اِمتدادِ زمانہ کے ساتھ سمرقند اور بخارا کی وہ مرکزی حیثیت نہ دُنیا میں رہی، نہ دُنیا کے تجارتی منظر نامے پر وہ کلیدی حیثیت کے حامل رہے اور نہ وہ سیاست کے بڑے مراکز رہے اور نہ ہی وہ خوش حالی کے سِمبلز کے طور پر دُنیا جہان کے نقشے پر کئی ایک لحاظ سے درخشندہ رہے۔ راشد کو اس بات کا بھی ملال ہے کہ مشرق نے اپنی تہذیبی دانش اور اپنے جوہر کے ذریعے اُس نے اپنے بڑے تہذیبی و تمدنی مراکز اجو اُستوار کیے تھے، وہ اب اپنی عظمت اور شان و شوکت کھو چکے ہیں اور اب اُن کی وہ اُس طرح کی مرکزیت اور وَقعت نہیں رہ گئی۔ ظاہر ہے کہ راشد جیسا آدمی جس نے مشرق و مغرب دونوں کو نہ صرف دیکھا ہو بلکہ جس کی نظر دونوں خطوں اور تاریخ پر بھی ہو، کلچرل انتھروپولوجی پر بھی نظر ہو، اور وہ جو شاعر بھی بے پناہ اِمکانات کا ہو! اور جو قدیم و جدید کا بھی شناور ہو! وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں کہ اب سمرقند اور بخارا کی عظمتِ رفتہ کو لوٹایا نہیں جا سکتا، اِس لیے کہ وقت اور تاریخ کو آپ Reverse Gear نہیں لگا سکتے۔ زندگی نے بہر طور آگے بڑھنا ہوتا ہے اور زندگی پرانی روایتوں کی بازیافت میں اپنا پینڈا کھوٹا نہیں کرتی اور نہ رُکتی ہے اور پلٹ کے دیکھتی ہے۔ راشد اب یہاں پر ایک پیغام دیتے ہیں اور وہ پیغام یہ ہے کہ سمرقند اور بخارا کی عظمت کے گُن گانے بند کرو۔ وہ اب قصۂ پارینہ ہو چکے ہیں۔ آج کے جو تمھارے تہذیبی مراکز ہیں اور جو زندہ تمدنی بلاد ہیں، تم اُن کی فکر کرو اور اُن کی پرداخت کے اُوپر، اُن کی تعمیر اور اُن کی ترقی کے اُوپر توجہ اور زور دو، اور وہ اپنی نظم میں نئے تمدنی مراکز کے طور جو سِمبلز لے کر آتے ہیں۔ اِس حوالے سے راشد کہہ رہے ہیں:

بخارا، سمرقند کو بُھول جاؤ

اب اپنے درخشندہ شہروں کی
طہران و مشہد کے سقف و در و بام کی فکر کرلو،
تم اپنے نئے دورِ ہوش و عمل کے دِلآویز چشموں کو
اپنی نئی آرزوؤں کے اِن خوب صورت کنایوں کو
محفوظ کرلو!(تیل کے سوداگر)(۲)

ہمارے ہاں صدیوں تک سمرقند اور بخارا کی شان و شکوہ کے ترانے گائے جاتے رہے حتیٰ کہ اُن کی عظمتِ رفتہ کے ناسٹیلجیا کو بیان کیا جاتا رہا ہے اور اب بھی کسی حد تک اُن کے ناسٹیلجیا میں بعض لوگ گرفتار ہیں۔ ایسے میں راشد یہاں پر ایک نہایت واضح پوزیشن لیتے ہیں کہ ماضی پرستی کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ ماضی کے اوراق ہیں۔ اب جو نئی زندگی اور اُس کے جو نئے تقاضے ہیں، اُس میں آپ کے جو تہذیبی و تمدنی سِمبلز ہیں، وہ سمرقند اور بخارا نہیں ہیں۔ وہ تہران و مشہد ہیں۔ وہ تہران و مشہد ہی کو کیوں اہمیت دیتے ہیں اور بھی تو تہذیبی و تمدنی مراکز ہو سکتے ہیں۔ تہران و مشہد ہی کو وہ کیوں تہذیبی و تمدنی سِمبلز کے طور پر لیتے ہیں؟ استنبول بھی اسلامی دُنیا کا بڑا شہر ہے، قاہرہ بھی اِسلامی دُنیا کا شہر ہے، اسلامی دُنیا میں اور بھی بڑے تہذیبی مراکز ہیں۔ وہ تہران اور مشہد ہی کی بات کیوں کرتے ہیں؟ وہ اِس لیے کرتے ہیں کہ جب تیل کی سوداگری جو ہے، تیل کی سوداگری کے ساتھ جو بیسویں صدی کے مشرق کی مطابقت (Relevance) بنتی ہے، وہ تہران اور مشہد کی بنتی ہے کہ ایران خود تیل پیدا کرنے والا ملک ہے اور ایران سے باہر مشرقِ وسطیٰ میں جو تیل پیدا کرنے والے ممالک ہیں، اُن میں کوئی ایسا بڑا تمدنی، تہذیبی یا ثقافتی مرکز نہیں ہے، نہ اُن میں کوئی کویت کا شہر ہے، نہ اُن میں کوئی ملائشیا اور انڈونیشیا کا شہر ہے۔ عراق کا شہر بغداد ضرور ہے، لیکن بغداد بھی عظمتِ رفتہ کا حصہ بن گیا ہے، اُس کے آگے کوئی نیا پرومِس نہیں ہے۔ ایسے میں راشد اُمیدیں وابستہ کرتے ہیں۔ اب یہاں آکر راشد کی Sensibility اقبال کی حِسّیت Sensibility سے مل جاتی ہے۔ اقبال نے بھی کہا تھا۔ اگر تہران مشرق کا جنیوا بن جائے تو کیا ہی عمدہ ہو! اقبال بھی جب مشرق کی عظمتِ رفتہ کے گُن گاتے ہیں تو وہ تہران کی شکل میں مشرق کا ایک نیا رُوپ دیکھ رہے ہیں جو مشرق کے تہذیب و تمدن کو بھی اور مشرق کی طاقت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ ن م راشد نے اپنی نظم ''تیل کے سوداگر'' میں تہران کے ساتھ مشہد کو بھی منسلک کر دیا ہے۔ مشہد ایک ایسا شہر ہے جو شیعہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مرکز ہے اور اُس کے ساتھ تہذیبی و تمدنی گریجر کا بھی ایک معاملہ ہے۔

تیل کی تجارت کے پس منظر میں راشد اپنی اس نظم کے ذریعے ایک پیغام دیتے ہیں اور وہ پیغام یہ ہے کہ عظمتِ رفتہ کے ترانے گانے بند کرو اور پرانے وہ جو تہذیبی و تمدنی مراکز ہیں، اُن کی صرف تاریخی حیثیت ہے، اُس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اب آپ سمرقند اور بخارا کے نغمے گانے چھوڑ دیں۔ اب آپ تہران اور مشہد کی فکر کریں چوں کہ تہران اور مشہد بھی تیل کی تجارت اور تیل کے سوداگروں کی نفسانفسی کی زد پر ہیں۔ اس میں یہ اِمکان موجود ہے کہ تہران اور مشہد کی بھی تہذیبی، تمدنی، تاریخی اور ثقافتی حیثیت اور جو مرکزیت ہے، کہیں وہ بھی معدوم نہ ہو جائے۔ کہیں وہ مرکزیت بھی چھن نہ جائے۔ اب آپ کو تہران و مشہد کی فکر کرنی چاہیے۔

سمرقند اور بخارا کیا ہیں؟ ن م راشد کے نزدیک یہ ماضی کے مزار ہیں۔ مطلب وہ سوئے ہوئے اور خوابیدہ ہیں اور تاریخ کے اوراق میں مدفون ہیں۔ وہ اپنی عظمتِ رفتہ میں مدہوش ہیں۔ 'ہمہ اوست' بنیادی طور پر وحدت الوجود کا سمبل ہے، یہاں روسی ہمہ اوست سے مراد وہ سینٹرل ایشیا کی جو ریاستیں ہیں، جن میں تاجکستان، ازبکستان، کازکستان شامل ہیں۔ تصوف کے بہت سے سلسلے وہیں سے چلے ہیں، سہروردی بھی، نقشبندی بھی اور دوسرے بھی تو یہ 'ہمہ اوست' تصوف کا ایک بہت بڑا وظیفہ ہے۔ یہاں راشد روس کو سوویت یونین کے معنوں میں لے رہے ہیں کہ سوویت یونین کا وہ حصہ، جہاں سے ہمہ اوست کی آوازیں اور لہریں اُٹھتی تھیں اور روس اس حد تک اِس عالمی تیل کی تجارت کا لٹیرا تھا بھی نہیں، جس طرح یورپین اور امریکن آئل کمپنیاں اور اُن کی جس طرح کی حکومتی پالیسیاں تھیں۔

تم اپنے نئے دورِ ہوش و عمل کے دلآویز چشموں کو
اپنی نئی آرزوؤں کے اِن خوب صورت کنایوں کو
محفوظ کر لو
اِن اُونچے درخشندہ شہروں کی
کوتہ فصیلوں کو مضبوط کر لو (تیل کے سوداگر)(۳)

اب کوتہ فصیلیں کیا ہے؟ راشد یہ محسوس کر رہے ہیں کہ نوسامراجیت کی جو یلغار ہے، ظاہر ہے جب دوسری عالم گیر جنگ ختم ہو گئی، یہ وہ زمانہ ہے، اُس دور میں سامراجیوں نے ایک نیا چولا بدلا، وہ فزیکل اور براہِ راست غلامی کے بجائے، اور اب وہ تجارت کے ذریعے مختلف ماضی کی نوآبادیات کی آزادی چھیننے کے درپہ ہیں اور تجارت اور معیشت کے ذریعے اپنا غلبہ کرنے کے درپہ ہیں۔ اب جو طہران اور مشہد کی جو کُہنہ بنیادیں اور جو کُہنہ دیواریں ہیں، اُن کے حوالے سے وہ کہہ رہے

ہیں کہ یہ آپ کے قدیم شہر ہیں اور اِن کا سارے کا سارا جو سٹر کچر ہے اور اِن کی جو قوت اور جوہر ہے اور اِن کی جو نامیات ہے، وہ ساری کی ساری کی بنیادیں کوتاہ ہو چکی ہے، وہ بنیادیں در حقیقت بوسیدگی کا شکار ہو چکی ہیں اور ضرورت اِس امر کی ہے کہ اِن شہروں کو نئے علم، نئے فلسفے اور نئی ٹیکنولوجی کا مرکز بنایا جائے، اگر ایسا نہیں ہو گا تو پھر اِس طرح ہو گا کہ وہی تیل کے سوداگر اِن شہروں کو بھی یرغمال بنالیں گے، اِن شہروں پر بھی اپنا تسلط قائم کر لیں گے اور یہ شہر جو نئی دانشِ شرق کے لیے اِمکانات پیدا کر رہے ہیں۔ اندیشہ یہ ہے کہ اگر اِن شہروں نے اپنے آپ کو سائنس میں، علم میں، ٹیکنولوجی میں اَپ گریڈ نہ کیا تو اِن شہروں کا انجام بھی سمرقند اور بخارا سے مختلف نہیں ہو گا۔

ہر اِک بُرج و بارو پر اپنے نگہباں چڑھا دو،
گھروں میں ہَوا کے سِوا،
سب صداؤں کی شمعیں بُجھا دو!
کہ باہر فصیلوں کے نیچے
کئی دِن سے رہ زَن ہیں خیمہ فگن،
تیل کے بُوڑھے سوداگروں کے لبادے پہن کر، (تیل کے سوداگر)(۴)

اب 'تیل کے بُوڑھے سوداگروں' میں ایک طرح کی ایمائیت ہے۔ یہ جو تیل کے آج کے سوداگر ہیں، یہ سوداگر تو نوخیز بھی ہیں اور تازہ دم بھی ہیں، لیکن انھوں نے بُوڑھے تاجروں کی طرح کے لبادے پہنے ہوئے ہیں، وہ جو علی بابا چالیس چور والے اور جو ماضی قدیم میں تاجر ہوتے تھے کہ انھوں نے پرانے تاجروں والے لبادے پہنے ہوئے ہیں، لیکن اندر سے اِن کے اِرادے نہایت خوف ناک اور خطرناک ہیں اور اِن کے اندر سے اِرادے یہ ہیں کہ آپ کے جتنے ثقافتی مراکز ہیں اور جو آپ کے اِمکانات کے جو مدار و معدن ہیں، یہ اُن کو ہڑپ کرنے کے چکر میں ہیں اور تیل کی جو تجارت ہے، وہ اِس وقت بہت بڑے سامراجی ٹُول کا درجہ اختیار کر چکی ہے اور اگر آپ نے اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے اِن شہروں کو جن سے اِمکانات وابستہ کیے جا سکتے ہیں، اگر اِن کو نئے علوم، ٹیکنولوجی، سائنس اور فکر و فلسفے سے تیّار نہ کیا تو یہ بھی سمرقند و بخارا کی طرح آثارِ قدیمہ کی صورت اختیار کر جائیں گے۔

وہ کل رات یا آج رات کی تیرگی میں،
چلے آئیں گے بن کے مہماں

تمھارے گھروں میں، (تیل کے سوداگر) (۵)

وہی علی بابا چالیس چور کی جانب اشارہ ہے، جو بغداد میں مہمان بن کے آئے تھے، لیکن اندر سے بہت بڑے ڈاکو تھے۔ یہ بھی ایک بلیغ قسم کا استعارہ ہے کہ شاعر تیل کے سوداگروں کو بُوڑھے سوداگروں کے مماثل قرار دے رہا ہے کہ وہ مہمان بن کر آئیں گے اور لوٹ مار کریں گے۔

وہ دعوت کی شب جام و مینا لنڈھائیں گے
ناچیں گے گائیں گے،
بے ساختہ قہقہوں، ہمہموں سے
وہ گرمائیں گے خونِ محفل (تیل کے سوداگر) (۶)

اُن کا طریقۂ واردات یہ ہے کہ وہ مہمان بن کے آتے ہیں اور اُس کے بعد قابض ہو جاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر پر قابض ہو گئی تھی یا جیسے ماضی میں دیگر مغربی کمپنیوں نے متعدد ممالک کو اپنی نوآبادیات بنالیا تھا۔ جیسے ڈَچ، فرانسیسی، پرتگالی اور ہسپانوی وغیرہ وغیرہ، کولونائزرز یا کولونِسٹ (نوآبادکار)، اِمپیریل یا استعماری قوتیں یا استحصال کرنے والے مغربی ممالک کہ جو تاجروں کے رُوپ میں دُنیا کے مختلف غیر یورپی ممالک پر قابض ہو گئے تھے اور اب اُن کا نیا ہتھکنڈا اور نیا ٹُول کیا ہے ؟ وہ تیل ہے اور تیل کے سوداگروں کے رُوپ میں وہ آکر آپ کی معیشت کے اُوپر، آپ کے تمدنی مراکز کے اُوپر اور آپ کے جو اِمکانات ہیں، اُن کے اُوپر وہ قبضہ کریں گے اور آپ پر غلبہ حاصل کریں گے اور آپ پر اپنی حکومت قائم کریں گے۔ ایسی صورتِ حال سے آپ کو ہوشیار ہونے کی ضرورت ہے۔ بظاہر وہ دعوت میں آئیں گے، ناچیں گے، گائیں گے۔ یہ شب کا ماجرا ہے:

مگر پَو پھٹے گی
تو پلکوں سے کھودو گے خود اپنے مردوں کی قبریں
بِساطِ ضیافت کی خاکسترِ سوختہ کے کنارے
بہاؤ گے آنسو،
بہائے ہیں ہم نے بھی آنسو!
گو، اب خالِ ہندو کی ارزش نہیں ہے

عذارِ جہاں پر وہ رِستا ہُوا گہرا ناسُور

افرنگ کی آزِ خونخوار سے بن چُکا ہے (تیل کے سوداگر)(۷)

ن۔م۔راشد کی شاعری اُن کے بڑے موضوعات سے تشکیل پاتی ہے۔اُن کی ذہنی و فکری پرداخت میں ایک تو مغربی استعماریت کو عمل دخل ہے تو دوسرے برطانوی استعماری صورتِ حال نے اُن کے اندر کئی ایک لحاظ سے ردِّ عمل کی صورتِ حال کو بھی جنم دیا اور پھر جب ہم اُن کے اُسلوب کی بات کرتے ہیں تو اُن کے اُسلوب کی تشکیل میں فارسی زبان کا نہایت گہرا عمل دخل ہے۔وہ استعماری حربوں کی قلعی تو کھولتے ہی ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ اُن کی نظموں میں کنائے اور استعارات کی وجہ سے کئی ایک لحاظ سے گہرائی اور گیرائی بھی پیدا ہوتی ہے۔راشد کی شاعری کے چند ایک فکری پہلوؤں کے حوالے سے خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''ماورا'' سے لے کر ''ایران میں اجنبی تک'' اور اس کے بعد ''لا=انسان'' کی نظموں کو غور سے پڑھا جائے تو راشد کی شاعری کا جو کردار تشکیل پاتا ہے۔اس کا تعلق ہم اس روایت بہ آسانی جوڑ سکتے ہیں، جسے ہم دانش وری کی روایت کہتے ہیں۔(۸)

راشد کی نظموں میں شامل ایک نظم ''تیل کے سوداگر'' بھی ایک ایسی ہی نظم ہے جو شاعر کی نگاہِ دور بیں اور نگاہِ دوررس کی غمازی کرتی ہے۔مذکورہ نظم اپنے اُسلوب کے اعتبار سے مفرس اُسلوب کی حامل ہے جب کہ اپنی فکر کے اعتبار سے راشد کی بصیرت اور دانش و حکمت کی عکاسی کرتی ہے۔راشد کا زاویۂ نگاہ استعماری قوتوں کے لوبھ کا پردہ بھی چاک کرتا ہے اور اُن قوتوں کی حیلہ گری سے بھی روشناس کراتا ہے۔راشد کے دور کے مسائل و مصائب استعماری دور کی جبریت سے جڑے ہوئے تھے۔دُنیا کئی ایک سطحوں پر شکست و ریخت اور انتشار کا شکار تھی۔اقتصادی حوالے سے بھی دُنیا کئی ایک اُلجھنوں اور پیچیدگیوں کا شکار تھی اور مغربی کولونیل قوتوں کی چالاکیاں اور دُنیا کی کمزور اقوام کو یرغمالی بنانے کی صورتِ حال الگ سے تھی۔تیسری دُنیا کے وسائل پر قبضے اور ایران کے تیل پر قبضے کا لوبھ الگ طرز کی غمازی کر رہا تھا۔مشرق کی انفعالیت اور زوال بھی اُس دور کا ایک المیہ تھا جو بڑی حد تک اب بھی ہے اور ظاہر ہے کہ گزشتہ ہی سے پیوستہ ہے۔

یہاں راشد زوالِ مشرق کا نوحہ بیان کر رہے ہیں کہ اگر آپ نے ان کو پہچانا نہیں ہے کہ یہ مہمان بن کے آئے ہیں، ضیافتیں اُڑانے والے ہیں۔صبح جب اُٹھو گے تو پھر تم اپنی پلکوں سے اپنے مردوں کی قبریں کھودو گے اور ضیافت کے مآل کے طور پر آپ غلام اور یرغمالی بن جائیں گے۔وہ لوگ آپ کی معیشت پر قبضہ کر لیں گے، معیشت پر قبضہ ہو جانے کے بعد

آپ کے علاقے تہران اور مشہد اُنھی کے یرغمالی بن جائیں گے۔ اُنھی کے قبضے میں چلے جائیں گے۔ اِس لیے ان سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

بہائے ہیں ہم نے بھی آنسو
ہماری نگاہوں نے دیکھے ہیں،
سیّال سایوں کے مانند گھلتے ہوئے شہر
گرتے ہوئے بام ودر
اور مینار و گنبد (تیل کے سوداگر)(۹)

اس میں ہندی مسلمان بھی آجاتے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے مسلمان بھی آجاتے ہیں۔ اُس میں سینٹرل ایشیا کی بھی مسلم ریاستیں آجاتی ہیں۔ اُس میں مسلمان بھی اور مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے ممالک اور اُن کے باشندے بھی آجاتے ہیں جن پر اب وہ یعنی اہلِ مغرب قبضہ کرنے کی ٹھان رہے ہیں اور اُن کے وسائل کو کھل کر لوٹنا چاہتے ہیں۔ ماضی میں کئی ایک ممالک جو ان کی نوآبادیات رہ چکی ہیں، ماضی میں اُن کے ساتھ یہی ہوا ہے اور اب تہران اور مشہد کو اور اُس کے باشندوں کو اور وہاں کے حکمرانوں کو ہوش کے ناخن لینے چاہییں، وہ اُنھیں بیدار کر رہے ہیں۔

مگر وقت مینار ہے
اور دُشمن اب اُس کی خمیدہ کمر سے گزرتا ہُوا
اُس کے نچلے اُفق پر لڑھکتا چلا جارہا ہے!
ہمارے برہنہ و کاہیدہ جسموں نے
وہ قید و بند اور وہ تازیانے سہے ہیں (تیل کے سوداگر)(۱۰)

'خمیدہ کمر' اور 'لڑھکتا اُفق' یہاں راشد نے تجسیم کر دی ہے۔ اُن شہروں کی، اُن کی معیشت کی، اور اُن کے اِمکانات کی، کہ اِن شہروں کی، اِن تمدنوں اور شہروں کی اور یہ جو نئے معدن ہیں، اِن کی کمر کمزوری کے باعث جُھکی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ کمر کمزوری کے باعث ہی جُھکتی ہے اور کمزوری کیا ہے؟ کہ ان کے پاس جدید علم نہیں ہے، ان کے پاس جدید ٹیکنولوجی نہیں ہے اور سائنس کا جدید علم نہیں ہے اور پھر یہ کہ اِن کی معیشت اِن کے اپنے اختیار میں نہیں ہے اور اس معذوری اور مجبوری نے انھیں خمیدہ کمر کر دیا ہے، ان کی کمر توڑ کے رکھ دی ہے اور خمیدہ کمر ان کی کمزوری کا سِمبل ہے کیوں

کہ جو تنومند اور صحت مند ہوتا ہے، اُس کی کمر تو نہیں جُھکی ہوتی اور دُشمن کون ہے ؟ جو تیل کی سوداگری کے بہانے آپ کو از سرِ نَو غلام بنانا چاہ رہے ہیں۔ آپ کی معیشت کو یر غمالی بنانا چاہ رہے ہیں۔ آپ کی ساری چیزوں اور وسائل پر غلبہ قائم کرنا چاہ رہے ہیں اور آپ پر اپنی نام نہاد حکومت مسلط کرنا چاہ رہے ہیں :

اور دُشمن اب اُس کی خمیدہ کمر سے گزرتا ہوا

اُس کے نچلے اُفق پر لڑھکتا چلا جا رہا ہے (تیل کے سوداگر)(۱۱)

اُنھوں نے یہ ایک بہت بڑا ڈایا گرام بنایا ہے۔ خمیدہ کمر، اور خمیدہ کمر کے آدمی کے اُوپر اگر کوئی سواری کرنا چاہے تو اُس نے لڑھکنا ہے اور ظاہر ہے کہ اُس نے نیچے کی جانب ہی لڑھکنا ہے۔ اب جب وہ لڑھکتا چلا جا رہا ہے تو اُس کے لڑھکنے میں بظاہر تو یہاں اُنھوں نے ایک آئرنی پیدا کی ہے۔ بظاہر تو جو خمیدہ کمر سے لڑھکے گا، نچلے اُفق کی طرف ہی جائے گا۔ بظاہر تو یہ اُس کا زوال ہے، لیکن یہ اُس کا زوال نہیں ہے۔ بات یہ ہے، جب وہ لڑھک کے خمیدہ اُفق کی طرف جا رہا ہے تو ابھی آپ حالتِ رقوع میں ہیں۔ وہ پھر آپ کو چِت کر دے گا۔ مطلب ابھی تو آپ اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں۔ کمزوری اور نقاہت کے باعث آپ صرف ایستادہ نہیں ہو سکتے، پھر یہ ہے کہ وہ آپ کو مکمل طور پر گرا دے گا، پوری طرح چِت کر دے گا اور چِت کرنے کے بعد آپ میں یہ سکت نہیں چھوڑے گا کہ آپ خمیدہ کمری کی حالت میں بھی رہیں یعنی آپ زیادہ خراب صورتِ حال سے دوچار ہونے والے ہیں۔ اگر آپ نے اپنے ان مراکز کو نہ بچایا، ان حفاظت نہ کی، اور ان مراکز کو کیسے بچا سکتے ہیں ؟ کہ آپ کے پاس وہ قوت ہونی چاہیے جس قوت سے آپ، اُن کے یعنی تیل کے سوداگروں کی یلغار کو اور اُن کے غلبے کو آپ روک سکیں اور وہ قوت ہے، آپ کے علم کی، آپ کی معیشت کی، اور آپ کی ٹیکنولوجی کی طاقت ہے، جس کے ذریعے آپ اُن کو روک سکتے ہیں۔

مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو !

مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو !

کہ دیکھی ہیں میں نے

ہِمالہ والوند کی چوٹیوں پر شعائیں

اُنھی سے وہ خورشید پُھوٹے گا آخر (تیل کے سوداگر)(۱۲)

راشد کو برٹش استعماری دور میں ایک فوجی کی حیثیت سے ایران میں رہنے کا موقع میسر آیا تھا۔اس طرح وہ ایک نئی ذہنی و فکری صورتِ حال سے اُن کا سابقہ پڑا تھا۔

اس طرح راشد پر مغرب کے حیلے اور حربے کُھلے تھے کہ کس طرح مکڑ جال میں دوسری اور تیسری دُنیا کے لوگوں کو پھنساتے ہیں۔ایشیائی لوگوں کی غیر فعالیت بھی راشد پر کُھلی تھی اور مغرب کی حیلہ جوئیوں کا بھی اُنھیں ادراک ہوا تھا۔راشد نے استعماری قوتوں کے مقامی گماشتوں کا بھی پردہ چاک کیا ہے۔راشد اُن لٹیروں کو لے کر بھی اپنے ڈر اور اندیشے کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ لٹیرے سوداگروں کے روپ میں شہر کے باہر خیمے لگائے بیٹھے ہیں اور کسی موقع کی تلاش میں ہیں کہ جیسے ہی موقع ملا اور وہ شہر پر قبضہ کر لیں اور پھر ایران کے تیل پر بھی اپنا قبضہ جمالیں جو اُن کا اصل ادعا ہے۔شاعر ایک اُمید اور نئی آس کی جوت بھی جگائے ہوئے ہے کہ آخری فتح حریت پسند مقامی لوگوں کی ہی ہوگی جو استعمار زدہ ممالک میں نئی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور آخری کامیابی اُنھی کو ملے گی۔اس طرح کی حقیقی آزادی کے اشارے راشد کی نظم ''نارسائی''اور''درویش'' میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

راشد صاحب کی نظم ''تیل کے سوداگر'' کے حوالے سے خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

> ''راشد کی نظموں میں ایک گہری سیاسی بصیرت ملتی ہے اور انسانی مساوات کا وہ تصور جو کسی فیشن یا کسی وقتی نعرے کا مرہونِ منّت نہیں ہے بلکہ شاعر کے اپنے ادراک کی دین ہے۔''(۱۳)

ظاہر ہے کہ ہِمالہ ہندوستان کا سب سے بڑا پہاڑ ہے یا پہاڑی سلسلہ ہے۔اَلوَند کا پہاڑی سلسلہ ایران اور سیستان کے درمیان میں واقع ہے۔اب وہ یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے اس طرح کی تمام تر صورتِ حال میں بچاؤ، ترقی اور بقا کے جو نئے اِمکانات ہیں، اور شعاعوں کی صورت وہ اِمکانات میں نے ہِمالہ اور اَلوَند کی چوٹیوں پر دیکھیں گے۔کون سی شعائیں اور کون سے اِمکانات؟

اُنھی سے وہ خورشید پُھوٹے گا آخر
بخارا، سمرقند بھی سال ہا سال سے،
جس کی حسرت کے دریُوزہ گر ہیں! (تیل کے سوداگر)(۱۴)

اب یہاں وہ اُمید وابستہ کر لیتے ہیں اور وہ اُمید وابستہ کر رہے ہیں کہ ہندوستان کی اُبھرتی ہوئی Placement جو ہے۔اب ہِمالہ کو آپ صرف بھارت سے منسوب نہیں کر سکتے۔ہِمالہ ساؤتھ ایسٹ ایشیا کا ایک طاقت ور سِمبل کے طور پر اپنے مفاہیم اور Metaphor کے ساتھ اُبھرتا ہے اور کوہِ اَلوَند جو سینٹرل ایشیا کو ایران کے ساتھ جوڑتا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ میں نے وہاں وہ شعائیں پھُوٹتی دیکھی ہیں، جن کی حسرت میں سمرقند اور بخارا بھی دَریُوزہ گر ہیں۔سمرقند اور بخارا دَریُوزہ گر کیوں ہیں؟ کہ سمرقند اور بخارا نے وہ توانائی کھو دی جو اُن کی عظمت کی ذِمہ دار اور ضامن تھی۔وہ علم کی توانائی تھی، وہ سلطنت کی توانائی تھی، وہ معیشت کی توانائی تھی، وہ توانائی اُن کے ایک بڑے تمدنی، ثقافتی اور تہذیبی مرکز ہونے کی توانائی اور طاقت تھی۔اب سمرقند اور بخارا تاریخ کے اوراق میں دفن ہیں، وہ اب اپنے ماضی کے قصے ہیں تو سمرقند اور بخارا بھی ہِمالہ اور اَلوَند کی چوٹیوں کی طرف حسرت سے دیکھتے ہیں کہ اُنھیں بھی یہ ہے کہ جو سورج ہمارے اُوپر غروب ہو چکا ہے، وہ ہِمالہ اور اَلوَند کی چوٹیوں سے نمودار ہو گا۔مقصد یہ کہ ایک نئی صبحِ اُمید جو ہے وہ باندھ رہے ہیں، راشد ہِمالہ اور کوہِ اَلوند کی چوٹیوں سے کہ یہ صبحِ اُمید جو ہے، یہ تیل کے سوداگروں کی ساری حیلہ گری اور چال بازی اور اُن کے ہتھکنڈوں کا توڑ کرنے کی سکت رکھتی ہے اور اِسی سے نئے اِمکانات وابستہ کیے جا سکتے ہیں۔راشد کی لغت اور فنی ہنر مندی کے ضِمن میں پطرس نے اُن کی کھل کر تعریف کی ہے۔ایک طرف تو اُنھوں نے قدیم طرزِ شاعری کے مقلدین سے جُدا راہ اُستوار کرنے پر راشد کو تحسینی کلمات سے نوازا ہے تو دوسری جانب اُن کی جدید لغت کی بھی تحسین و تعریف کی ہے۔اِس ضمن میں پطرس بخاری لکھتے ہیں:

"غنیمت بلکہ شکر ہے کہ آپ پڑھنے والے کو محض بوجھول تو نہیں مارتے بلکہ جہاں بے اعتدالی بھی کرتے ہیں، وہاں بھی خون کو گرما ہی دیتے ہیں، چناں چہ مجھے آپ کے 'داریوش' اور 'دلّاک' اور 'لباسِ کبودی' اور 'لہستان' اور 'کوروادی' واللہ سب گوارا ہیں، بلکہ میں آپ کی قوت کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے بڑے بڑے کوہ قاف الفاظ کو بھی ایسا مطیع کر لیا ہے کہ خانہ زاد معلوم ہوتے ہیں۔آپ جب بھی اُنھیں بُلائیں، حاضر ہو جاتے ہیں اور ہر خدمت بجا لاتے ہیں۔"(۱۵)

پطرس نے راشد کے شعری مجموعہ 'ایران میں اجنبی' میں اُن کے ڈِکشن کو نہ صرف سراہا ہے بلکہ فارسی کے متعدد نامانوس الفاظ کے نئی نظم میں فنی ہنر مندی، بے ساختگی و برجستگی کے ساتھ اُردو میں استعمال کے تخلیقی ارتقاع اور اُپج کے منفرد انداز کو بھی لائقِ داد و تحسین ٹھہرایا ہے اور مذکورہ عنصر کو راشد کے قلم کی انفرادیت قرار دیا ہے۔راشد جیسے منفرد تخلیق کار ہی فارسی کے مذکورہ نامانوس الفاظ کو اپنے تمام تر تخلیقی دروبست کے ساتھ نہ صرف نظم میں برمحل استعمال کر سکتے تھے بلکہ اُردو کے ذخیرۂ الفاظ کو نئے ذائقے سے بھی مانوس کرا سکتے تھے۔راشد کی زبان و بیان پر مہارت اور قدرت بھی اُن کی

تخلیقی انفرادیت پر دال قرار دی جاسکتی ہے۔ 'داریوش' ساسانی بادشاہوں کا ایک بہت بڑا بادشاہ تھا، اس نام کو شاعر نے تخلیقی پیرائے میں برتا ہے۔ اسی طرح اُنھوں نے اپنی نظم ''من و سلویٰ'' میں 'لباسِ کبود' کی ترکیب کا استعمال کیا ہے، یعنی 'نیلا لباس' اور پھر لستان جو ایک علاقے کا نام ہے، 'لستان' کا لفظ بھی اُنھوں نے اپنی نظم 'من و سلویٰ' میں استعمال کیا ہے اور 'کُور وادی' کی ترکیب بھی اسی نظم میں برتی ہے جس سے مراد اندھا جنگل ہے۔ راشد نے کنائے کا استعمال کرتے ہوئے اپنی نظم 'من و سلویٰ' میں بیرونی استعماری قوتوں سے مقامی لوگوں کو بے دار رہنے اور بے خبر رہنے کی جانب اشارے دیے ہیں اور عجمی سماجی اور ثقافتی صورتِ حال کا برصغیر کی تاریخی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی صورتِ حال سے کئی ایک سطحوں پر تقابل بھی کیا ہے مگر تخلیقی و شعری انداز میں مذکورہ معاملہ جلوہ گر ہوا ہے۔ 'من و سلویٰ' میں داریوش بزرگ کا ذکر ملتا ہے جو نوشیرواں کے خاندان سے تھے۔ داریوش ایک ساسانی بادشاہ تھا اور اُس وقت کی سلطنت بہت وسیع و عریض تھی اور ظاہر ہے کہ اُس کا عدل بھی معنی خیز تھا۔ داریوش کی حکومت اور اُن کے دور کے نظام عدل کو بھی شاعر نے سراہا ہے اور اُس کی بقا اور تسلسل کے بھی وہ خواہاں ہیں۔ اب یہاں اُس پہلے انگریز کو بھی شاعر اپنی کراہت کا نشانہ بناتا ہے کہ جو سوداگری کے حیلے سے برصغیر میں داخل ہوا تھا اور پھر انگریز غیر منقسم ہندوستان پر قابض و متصرف ہو گیا تھا۔ شاعر عجمیوں کو بھی تاریخی اور آس پاس کی علاقائی صورتِ حال سے روشناس کراتا ہے کہ وہ کیسے پہلے پہل تجارت کے بہانے آتے گئے اور پھر مرورِ ایّام کے ساتھ غیر منقسم ہندوستان پر قابض ہو گئے تھے اور لوٹ کھسوٹ کا لامتناہی سلسلہ جاری رکھا تھا۔ اب ایران کے تیل اور معدنی ذرائع پر بھی وہ اپنی گرسنہ یعنی بھوکی نظریں گاڑے ہوئے ہیں۔ شاعر دیکھ رہا ہے کہ فرنگی راہ زن ہے اور اب ایران کے وسائل اور زمین پر بھی قبضہ کرنے کے لیے مضطرب ہے۔ شاعر کو یہ بھی اندیشہ ہے کہ مغربی استعماری قوتیں اب عجم پر بھی قبضہ کرنے کے درپے ہیں۔ پہلے تو مغربی استعماری قوتوں نے یلغار کر کے پورے برصغیر اور مشرق کے بیش تر علاقوں پر قبضے کیے، اب وہ گرسنہ اور بھوکی نگاہوں سے سرزمینِ ایران کو بھی اپنا نشانہ بنانے پر تُلی بیٹھی ہیں۔ ایک ہی دارِ عنکبوت کے جال میں کم و بیش پورے ایشیا کو مغربی نوآبادکاروں نے مقید کیا ہوا ہے۔ شاعر تاریخ میں بھی غواصی کرتا ہے اور ماضی کے حملہ آوروں یعنی منگولوں (مغول) اور چنگیز خاں کے حملے کو بھی علامتی انداز میں بیان کرتا ہے۔ یہی شاعری کا اعجاز ہے کہ اس میں کنائے، استعارے اور علامات و تلمیحات کے وسیلے سے بڑے بڑے تاریخی و تہذیبی واقعات اور شکست و ریخت کو بھی موضوعِ سخن بنایا جاسکتا ہے۔ راشد نے بھی استعارے اور کنائے کے تخلیقی استعمال سے تاریخی صورتِ حال کی بازیافت کی ہے۔ ایران اور برصغیر پر دو بڑے حملے ہوئے، ایک چنگیزیوں کا حملہ اور یلغار اور دوسرا انگریزوں کا حملہ جو ماضی میں

برصغیر پر ہوا تھا۔ شاعر نے اپنی نظم ''من و سلویٰ' میں ماضی کے دو بڑے مذکورہ حملوں کا اشارہ دیا ہے اور اہلِ عجم کو انگریزوں کے ممکنہ حربے اور حملے سے باخبر کیا ہے۔ چین کے اُوپر والے وسطی ایشیائی علاقے کے چنگیزوں کے حملے کو بھی کنائے کے انداز میں لائے ہیں اور پھر نوآبادیاتی دور کی یلغار اور استعماری صورتِ حال کو بھی علامتی پیرائے میں اُجاگر کیا ہے اور مستقبل کے خطرات سے آگاہ کیا ہے۔ راشد کی نظم 'من و سلویٰ' ایک جانب تو استعماری قوتوں کے مخفی ایجنڈے کا پردہ چاک کرتی ہے تو دوسری جانب اہلِ عجم کو مستقبل کی صورتِ حال سے بھی باخبر کرنے والے افکار سے روشناس کراتی ہے۔ شاعر ماضی اور تاریخ کو حوالہ بنا کر انگریزوں کی یلغار سے بچانے کا آرزومند ہے۔ لہٰذا شاعر کی آرزومندی یہ ہے کہ مقامی لوگوں کو بھی فعال ہونا چاہیے جو کہ بڑی حد تک غیر فعال ہیں۔ یہ تو ''من و سلویٰ'' کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ اگر فعال ہوں گے تو ہی بیرونی قوتوں کا مقابلہ کر پائیں گے۔ شاعر نے موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر عجمی اور مقامی لوگوں کے فعال ہونے کی بات کی ہے۔ راشد اس امر سے بہ خوبی آگاہ ہیں کہ اب کہیں سے کوئی 'من و سلویٰ' نہیں اُترے گا۔ اب اگر آپ اپنی حفاظت کا سامان نہیں کریں گے تو بیرونی یلغار کا مقابلہ کیسے ممکن ہو سکے گا۔ راشد کی نظموں میں کئی ایک لحاظ سے ردِّ استعماری فکر موجود ہے اور پوری اور بھرپور توانائی کے ساتھ اپنا احساس دلاتی ہے۔

راشد کی نظم ''من و سلویٰ'' میں بھی سامراج کی استعماری چالوں کو استعاراتی انداز میں بے نقاب کیا گیا ہے۔ شاعر کو اندیشہ ہے کہ استعماری قوتیں للچائی ہوئی نگاہوں سے سرزمینِ عجم پر اپنا تسلط جمانے کے لیے مضطرب و بے قرار ہیں۔ تخلیق کار اپنی مذکورہ نظم میں استعماری قوتوں کی چالاکیوں اور حیلہ جوئیوں کو بے نقاب کرتا ہے اور مقامی لوگوں کو یہ باور کراتا ہے کہ اب کہیں کوئی باہر سے تمھیں بچانے نہیں آئے گا۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے خود کو تیّار کر لو۔ تخلیقی اور فکری اعتبار سے راشد ایک منفرد شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت انفرادیت کے بھی حامل ہیں۔ اُن کی شاعری کے موضوعات بھی بڑے ہیں اور اُن کی فکر بھی بڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ تکنیک کے اعتبار سے اُن کی نظموں میں آزاد نظم کی تکنیک کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ ن م راشد کی شاعری کے متعلق صفدر میر لکھتے ہیں:

'''ایران میں اجنبی' سیاسی طنزوں کا مجموعہ ہے۔ شاعر ذاتی اور داخلی طرزِ فکر سے آگے نکل گیا۔ 'نئی دُنیا'، 'نئے انسان' کے معاشرتی رشتوں کی تلاش میں سرگرم ہے۔ وہ نیا انسان جسے دوسری عالمگیر جنگ کی بھٹّی میں پگھلایا اور ڈھالا جا رہا تھا۔ تیسری دُنیا کے ظُلم پروردہ غلاموں کے بے پناہ ہجوم کے بارے میں راشد کو جو تشویش تھی۔ اس کے آثار اس کی پہلی تصنیف کی بعض نظموں میں بھی پائے جاتے ہیں۔''(۱۶)

راشد کی نظم ''زنجیر'' میں انقلاب کی ایک بے باکانہ گونج سنائی دیتی ہے۔مذکورہ نظم کے ذریعے شاعر مقامی ایشیائی لوگوں کو استعماری اور کولونیل قوتوں کے خلاف بیدار کر رہا ہے۔دُنیا کی دبائی گئی اقوام میں ایک نیا طرزِ احساس جو بڑی حد تک آزادی کے اُسلوب سے مملو ہے،اُس کو بیدار اور اُجاگر کیا گیا ہے اور آزادی کی ایک اُمید کا احساس دلایا گیا ہے۔

راشد صاحب اپنے دور کی شاعری کے محرکات کچھ طرح بیان کرتے ہیں:

ہمارے دور میں جب دُنیا میں خوف ناک ترین جنگ برپا تھی اور اُس جنگ کے اسباب اس سے بھی زیادہ ہولناک تھے۔شاعری کے ذریعے محض ذہن کے اسرار دریافت کرنے کی کوشش کرنا یا فن کو لفظی جادوگری کا وسیلہ بنانا،اپنے عشق کے غم و غصے کی مجرد پیروی کرتے رہنا،ایک ابدی انسانی فریضے سے کنارہ کشی اختیار کرنا تھا اور اس کنارہ کشی کی سزا مزید پستی اور ذلّت کے سوا کچھ نہ ہو سکتی تھی۔''(۱۷)

راشد کے شعری مجموعہ ''ایران میں اجنبی'' میں اجتماعی فعالیت اور احساسِ ذمہ داری کی جانب اشارے ملتے ہیں۔ظاہر ہے کہ اجتماعی ذمہ داری کا احساس کئی ایک لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے اور اس میں کسی حد تک محفوظ زندگی کی بھی ضمانت کا کچھ نہ کچھ سامان مخفی ہے۔اس طرح کا اجتماعی احساس قوموں کو ایک طرف تو بیرونی قوتوں کے حملوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے تو دوسری جانب اقوام کو مضبوطی بھی فراہم کر سکتا ہے۔

راشد صاحب کی نظم ''زنجیر'' میں بھی برصغیر کو جس طریقے سے استعمارہ زدہ کیا گیا تھا اور برٹش کونیل قوت نے جس حیلے بہانے سے اور سوداگری اور تجارت کے بہانے سے اور کئی ایک لحاظ سے جیسے مقامی لوگوں کو اپنے مکڑ جال میں پھنسایا تھا اور غلام اور یرغمالی بنایا تھا۔اُس کی شکست و ریخت اور زبوں حالی کی استعاراتی و علاماتی انداز سے جلوہ گری کرتی ہے۔ اِس ضمن میں میراجی لکھتے ہیں:

''راشد کی اس نظم میں ایک ایسے خطے اور ملک کی صورتِ حال اور نقشہ کنایوں اور استعارات سے پیش کیا گیا ہے جو صدیوں سے غلامی کے جکڑبند، بے بسی، بے چارگی، لاچارگی اور مشقت میں زندگی گزار رہا ہو۔اس نظم کے علائم و رموز سے بھی ایک ملک کی غلامی کی غمازی کا احساس جلوہ گر ہوتا ہے۔۔۔اپنے استعارات اور کنایوں کی وجہ سے تخلیق کار کی یہ نظم ایک ارتقاع کے درجے کی عکاسی کرتی ہے، نیز سیاسی اعتبار سے اغلباً یہ راشد کی اولین نظم ہے۔اگرچہ اس نظم میں برطانوی فرنگی خواتین اور اُن کے

بہت زیادہ حسن اور زیب وزینت کا احساس اُن کی جنسی رغبت کی جانب انسانی ذہن وفکر
کو لے جاتا ہے اور اس طرح کا خیال ایک فرد کے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ شاید اسی طرح
کی خواتین کے ہاں ناکامی ہی تخلیق کار کے لیے اس للکار کی تحریک کا باعث بنی ہے،
لیکن اگر ایسا بھی ہے تو یہ نفس لاشعوری کی بات ہے۔"(۱۸)

راشد اپنی نظم 'تعارف' میں ایک ایسے انسان کے آرزومند ہیں جو دُنیا میں اپنے علم، ٹیکنولوجی، سائنس اور نئے فکر وفلسفہ کی تخلیق کا نہ صرف حامل ہو بلکہ دُنیا جہان کو آگے لے کر جانے کے جوہر سے مالامال ہو! اور جو تخلیق کے جوہر سے عاری آدمی ہے، اُس کی راشد کے نظامِ فکر میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے، جسے آج کے انسان کی بقا اور ارتقا کا ضامن سمجھا جا سکے۔

اَجل، اِن سے مل،
کہ یہ سادہ دل
نہ اہلِ صلوۃ نہ اہلِ شراب،
نہ اہلِ ادب اور نہ اہلِ حساب،
نہ اہلِ کتاب اور نہ اہلِ مشین
نہ اہلِ خلا اور نہ اہلِ زمین،
فقط بے یقین،
اَجل، اِن سے مت کر حجاب
اجل اِن سے مل! (تعارف)(۱۹)

اب دیکھیے، راشد کی یہ نظم بیک وقت سادہ بھی ہے اور پیچیدہ بھی، اور اَجل جو ہے، وہ تشویش کا اور شوق کا پہلو لیے ہوئے ہے، اور اَجل ایک ایسی حقیقت ہے، جس سے مفر ممکن نہیں۔ یہ انسان کا نصیب ہے۔ ایک نہ ایک دن اسے اجل کے گھاٹ اُترنا پڑتا ہے، لیکن یہاں پر راشد اپنے بڑے وژن کو کام میں لاتے ہوئے، اَجل سے کس طرح کے اثباتی کردار کا تقاضا کرتے ہیں اور اَجل کو کون سا کردار سونپنا چاہتے ہیں! ن م راشد اَجل کا وہ کردار تجویز کرتے ہیں جو یہاں شاعر کی خواہش اور آرزو ہے کہ وہ محض ایک بات نہیں ہے، یہ اُن کا لغت کا ایک جہان ہے، اور ایک جہانِ نَو دریافت کرنے کی سعی

ہے، محض شاعرانہ لن ترانی نہیں ہے بلکہ وہ جب امکانات کو کھوجتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ اَجل کا وُجود ایک سِکّہ بند کردار ہے جو خوف کی چادر میں لپٹا ہوا ہے اور جِس سے ایک تنافر کا، ایک برات کا جو انسانوں کا رویہ رہا ہے۔ کیا اَجل سے کوئی اور بھی کام لیا جا سکتا ہے؟ زندگی کو ختم کرنے کے علاوہ کوئی کام لیا جا سکتا ہے؟ تو وہاں شاعر اَجل سے تعارف کرواتا ہے۔ کن کا؟ یعنی ان سادہ دِلوں کا جو اِس دُنیا میں جاری جو بھی کشمکش ہے، مفادات کی، طاقت کی اور غلط، صحیح استعمال کی، تسلط کی، بہت ساری جبروت کی اور جبریت کا جو نظام ہے، تو اَجل سے مخاطب ہو کر راشد کہتے ہیں۔ زندگی میں جن کا کوئی بڑا مقصد نہیں ہے یعنی جو دُنیا میں آئے اور ایک ہی ڈگر پر زندگی گزاری، کھایا پیا اور کوئی بڑا کام انجام نہیں دیا یعنی جنھوں نے کوئی تخلیقی کام انجام نہیں دیا، اور پھر یہ کہ دُنیا سے جاتے وقت اُن کے کریڈٹ میں کوئی بڑا تخلیقی کام تو کُجا کوئی چھوٹا سا کریڈٹ بھی نہیں رہا، یعنی جنھوں نے اقتصادیات کے میدان میں بھی کوئی کارنامہ انجام نہیں اور نہ ہی زندگی کے کسی دوسرے شعبے میں اور مر گئے۔ راشد اُن سے مخاطب ہیں:

اَجل ان سے مل کہ یہ سادہ دِل نہ اہلِ شراب، نہ اہلِ ادب اور نہ اہلِ حساب، نہ اہلِ کتاب اور نہ اہلِ مشین، نہ اہلِ خَلا اور نہ اہلِ زمیں، فقط بے یقیں

یہ راشد کا ایک مخصوص انداز ہے، نظمیہ شاعری کے ذریعے جو اُن کا ایک خطیبانہ انداز اور جُداگانہ رنگ ہے، یعنی مکالمے سے اُوپر اُٹھ کر وہ مکالمہ تو کرتے ہیں، لیکن اُن کے مکالمے میں ایک خطیب کا آہنگ اور ایک خطیب کا گھن گرج بھی شامل ہو جاتا ہے، اب جن کا وہ تعارف کرا رہے ہیں، تعارف کن لفظوں میں کروا رہے ہیں کہ جن سے ازل کو ملانا چاہ رہے ہیں، وہ وہی ہے، جن کو فرانز فینن نے ''اُفتادگانِ خاک'' سے منسوب کیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نہ اہلِ ہوس ہیں، نہ اہلِ صلوۃ ہیں۔ اہلِ صلوۃ سے مراد یہ ہے کہ جو تقویٰ کا اور ایک عبادت گزاری کا جو نشّہ اور خمار ہوتا ہے۔ خمار اہلِ شراب کو جو ہوتا ہے اور وہ جو اپنی ہی سرشاری میں اور اپنی ہی کسی موج میں مبتلا ہوتے ہیں۔

پھر نہ اہلِ ادب اور نہ اہلِ حساب،
نہ اہلِ کتاب۔۔۔
نہ اہلِ کتاب اور نہ اہلِ مشین،
نہ اہلِ خلا اور نہ اہلِ زمین (تعارف)(۲۰)

یعنی بات یہ ہے کہ جن سے اَجل کا تعارف کروایا جارہا ہے، وہ ان سارے لوازمات کی آلائشوں سے آزاد ہیں تو یہ کیا ہے؟ یہ وہ بے یقین لوگ ہیں کہ جنھیں نہ اہلِ گفتار کا تقرب حاصل ہے اور نہ ہی سائنس اور ٹیکنولوجی میں اُن کی کوئی رغبت اور دلچسپی ہے، یعنی اہلِ مشین بھی نہیں ہیں اور جنھیں عالمی سرمائہ داروں اور سرمایہ کاری کا بھی تقرب حاصل نہیں ہے اور جو اختیار کی راہ داریوں کے درمیان راندۂ درگاہ ہیں اور بے یقینی کا شکار ہیں اور بے نشانی جن کا کل سرمایۂ حیات ہے، ایسے لوگ گلی کُوچوں میں کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے پھرتے ہیں۔ اَجل سے اُن کا تعارف کروایا جارہا ہے اور پھر یہ کہ اَجل اِن سے مت کر حجاب، اَجل جو ہے جب تک اَجل کا ایک کردار ہے اور اُس کا اپنا ایک روایتی تعارف ہے، وہ یہ ہے کہ اَجل سامنے نہیں آتی، جب تک کسی بھی ایسے شخص یا اشخاص کا متعین وقت نہ آجائے، یعنی اَجل روح قبض کرنے سے پہلے نہیں آتی، یعنی اِس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے انسان سے حجاب کیا ہوا ہے۔ اُس نے زندگی سے بھی حجاب کیا ہوا ہے، وہ اسی وقت سامنے آتی ہے، جب اُسے زندگی کو ختم کرنا ہوتا ہے، یہاں پر اَجل سے مخاطب ہو کر وہ کہتے ہیں کہ اَجل اِن سے حجاب نہ کر۔ یہ جو ایک غیر تخلیقی سطح پر زندگی گزارنے والے کردار ہیں اور جن کا انسانی بقا اور ارتقا اور سربلندی کے حوالے سے کوئی بھی تخلیقی اور تعمیری کردار نہیں ہے:

بڑھو، تم بھی آگے بڑھو،
اَجل سے ملو،
بڑھو، نَو تونگر گداؤ
نہ کشکولِ دریوزہ گردی چھپاؤ
تمھیں زندگی سے کوئی ربط باقی نہیں،
اَجل سے ہنسو اور اَجل کو ہنساؤ (تعارف) (۲۱)

اب دیکھیے۔ یہاں اَجل سے منسوب جو ملفوف کردار ہے، اور اَجل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ زندگی اس کا ایک شکار ہے اور ظاہر ہے کہ اَجل زندگی کا شکار کرتی ہے۔ یہاں پر واضح طور پر راشد کا تخاطب 'اُفتادگانِ خاک' ہیں اور ''نو تونگر گداؤ'' یہ ایک بہت نئی اصطلاح ہے جو نوسامراجیت کی اصطلاح ہے اور جس کا تعلق براہِ راست عالمی سوہوکاری کے نظام سے ہے، ایسے میں وہ کہتے ہیں:

بڑھو نو تو نگر گداؤ

نَو تو نگر گدا اِس قدر منفرد اصطلاح ہے کہ جنھوں نے عالمی سامراجیت کو اور عالمی ساہو کاری کے نظام کو بہت قریب سے دیکھا ہے تو وہ اُنھیں کہتے ہیں، یعنی نو تو نگر گداؤں سے کہتے ہیں:

بڑھو، نَو تو نگر گداؤ (تعارف)(۲۲)

یعنی ایک جانب اَجل کو مخاطب کر رہے ہیں اور اُفتادگانِ خاک سے اپنا فاصلہ کم کر رہے ہیں تو دوسری جانب وہ زمین کے تباہ حال لوگوں کے ساتھ ایک نیا وصف اور ایک نیا کردار منسوب کر رہے ہیں کہ یہ ایک نَو تو نگر گدا ہیں یعنی بنیادی طور پر یہ مانگنے والے ہیں، بھکاری ہیں۔ عالمی ساہو کاری کے نظام نے بنیادی طور پر انھیں نَو تو نگر کر دیا ہے یعنی نئی تو نگری اُن کو ملی ہے۔ سرمائے کے باعث عالمی ساہو کاری کے اداروں سے جو یہ قرض کی یا نام نہاد اِمداد کی شکل میں جو خیرات لیتے ہیں۔ اس کے عوض زندگی کی ساری رَمق اور زندگی کے سارے اِمکانات ان سے نچوڑ لیے جاتے ہیں کیوں کہ عالمی ساہو کاری کا یہ نظام اِس قدر جاں کش ہے اور اِس قدر انسانیت کش ہے کہ عارضی طور پر کچھ مالی وسائل فراہم کر کے انسانوں کی روح تک کو گروی رکھ لیتا ہے اور انسانوں کے اندر جتنی تخلیق اور امن کی توانائی ہے، اُس سب کو رہن کر لیتا ہے۔ اب یہاں ایک نیا پہلو اُجاگر ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ عموماً کہا جاتا ہے کہ شاعر کا یا شاعری کا منصب معاملات کا یا مسائل کا حل پیش کرنا نہیں ہوتا، لیکن بسا اوقات شاعر ان عمومی وظیفوں سے انحراف بھی کرتا ہے۔ اِس نظم میں شاعر نے ایک تجویز (Suggestion) دی ہے کہ اَجل کے ساتھ دوستی کیسے ہو سکتی ہے؟ اَجل کے ساتھ دوستی اُن کی جو 'اُفتادگانِ خاک' ہوتے ہیں:

اَجل سے ہنسو اور اَجل کو ہنساؤ

کہ یہ جو اَجل کا خوف ہے، اِسے تم دُور کر دو اور اَجل کو تجویز کیا جا رہا ہے کہ تم بھی اپنے حجاب کو دُور کرو۔ فاصلو کو کم کرو اور یہ جو پوشیدگی ہے، اِس کو کم کرو۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو جاؤ اور وہ جو اَجل کے ساتھ ایک سفّاک کردار منسوب ہے، اُس نے زندگی کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے۔ شاعرانہ رفعتِ احساس کے تحت اِس کلاسیکل کردار کو اَجل کہا ہے۔ اَجل کا کردار زندگی کو قبض کر لینے والا ہے اور انسان کا کردار ڈر اور خوف زدگی کا ہے۔ وہ دونوں کو اپنے اپنے کردار کی روایتی دست برداری کا مشورہ دیتے ہوئے، دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتے ہیں، لیکن کس کے ساتھ؟ ظاہر ہے کہ اَجل کے ساتھ ہی ہاتھ بڑھانے کی بات ہے۔

اَجل سے ہنسو اور اَجل کو ہنساؤ

بڑھو، بندگانِ زمانہ بڑھو بندگان درم،
اَجل، یہ سب انسان منفی ہیں،
منفی زیادہ ہیں، انسان کم!
ہو، اِن پر نگاہِ کرم! (تعارف)(۲۳)

آپس میں تم ہنسو اور آپس میں وہی ہنستے ہیں جو بے تکلف ہوتے ہیں، جہاں دوستی کا ایک گمان ہوتا ہے، یہاں راشد کا مخاطب ایک عام انسان ہے۔ ظاہر ہے کہ بالادست طبقات نہیں ہیں، یہاں راشد کا مخاطب وہ انسان نہیں ہے جو ہڈیوں کا گودا تک نچوڑ لیتا ہے، وہ، جس اَجل سے دوستی کرانا چاہ رہے ہیں اور جس کے ساتھ مل کر ہنسنا، اور ہنسانا چاہ رہے ہیں، وہ زمین کے تباہ حال لوگ ہیں اور وہ کہتے ہیں:

بڑھو، بندگانِ زمانہ بڑھو، بندگانِ درم،
اَجل یہ سب انسان منفی ہیں،
منفی زیادہ ہیں، انسان کم، (تعارف)(۲۴)

یہاں نسخہ کیمیا یہ ہے کہ اَجل کا جو معلوم کردار ہے، وہ نگاہِ کرم والا نہیں ہے۔ اَجل کا معلوم کردار سفّاکی اور بے رحمی کا ہے۔ نئے کردار میں ن م راشد اَجل کو ایسے مقام پر متمکن دیکھنا چاہتے ہیں کہ اَجل جو ہے، وہ انسانوں کا شکار کرنے کے بجائے، اور انسانوں کو خوف زدگی میں مبتلا کرنے کے بجائے، انسانوں کے ساتھ دوستی رکھے اور وہ انسان جو نہ اہلِ صلوۃ والے ہیں اور نہ اہلِ مشین کے تقرب والے ہیں، اُن انسانوں پر اَجل جو ہے، وہ نگاہِ التفات ڈالے اور اَجل اُن کے اور اپنے درمیان فاصلوں کو کم کر کے ایک نیا رشتہ اُستوار کرے جو دوستی کا ہو! ہنسنے اور ہنسانے کا ہو اور جو دونوں کے درمیان فاصلوں اور دُوری کو ختم کرنے والا ہو۔

ع الم خوندمیری نے راشد کے تصورِ انسان کی تعبیر سے پیش تر مارکس کے تصورِ انسان کی کچھ اس انداز سے تفہیم و تعبیر کرنے کی سعی کی ہے جس کی مدد سے راشد کے نئے انسان کی نئی تفہیم و تعبیر میں بھی مدد مل سکتی ہے۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> ''بیسویں صدی کے تیسرے دہے کی اُردو شاعری میں زیست کی کُلّیت بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور زیست کا وُجود سے رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ اِس کی بنیادی اور اہم وجہ

غالباً یہ تھی کہ اس دور کے تخلیق کاروں کی اکثریت نے جنھیں اُن کے احباب اور مخالفین ترقی پسند شعرا اور تخلیق کاروں کے اسما سے یاد کرتے ہیں۔ زندگی کی ایک صورت اور سطح کو زندگی کا حاصل وصول اور نتیجہ سمجھ لیا اور کارل مارکس جیسے صاحبِ فہم و بصیرت کو بھی اُردو کے قارئین کی نظر میں کم تر اور رُسوا کر دیا۔ کارل مارکس کی کبھی یہ مرضی نہیں تھی اور نہ ادعا و منشا تھا کہ معاشرتی انسان کو یا انسان کی معاشرتی اور اقتصادی و معاشی حیثیت کو تقدم اور اولیت کا درجہ دے دیا جائے بلکہ وہ تصوریت پسند مفکرین کے اس تسامح اور فرو گزاشت کو دور کرنے کا آرزو مند تھا کہ انسان کی ماہیئت انسانوں کے کُلّی اور اجتماعی ارتباط سے الگ کوئی وُجود اور حیثیت رکھتی ہے۔'(۲۵)

ظاہر ہے کہ راشد ایک خرافاتی اور روایتی انسان کی بجائے ایک ایسے انسان کی تخلیق کی جانب توجہ دلاتے ہیں جو اختراع و ایجاد اور نئی تخلیقات پر قادر ہو، جس کی زندگی ساکت و جامد نہ ہو بلکہ تحرک اور جوہر سے عبارت ہو۔ راشد کا نیا انسان وُجود اور زیست کی صداقت اور حقیقت تک پہنچنے کا ایک مستحکم وسیلہ اور ذریعہ ہے جو کائناتی صداقتوں کا منصۂ شہود پر لانے کا ایک مضبوط حوالہ بن سکتا ہے۔ ایک ایسا انسان جس کی زندگی تحرک سے عبارت ہو اور وہ نئے وژن اور نئے فلسفے سے مالامال ہو! وہی نئے انسان کی ماجرائیت کو نہ صرف بیان کر سکتا ہے بلکہ نئے انسان کے سفر کو پہلے سے بہتر بھی بنا سکتا ہے اور جو ہر طرح کی کُلّیت پسندی اور جکڑ بند سے آزاد ہو۔

حوالہ جات

۱۔ ن۔ م۔ راشد: شخصیت اور فن، (مرتبین: مغنی تبسم / شہریار)، نئی دہلی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ص ۱۳۔
۲۔ ن م راشد، کُلّیاتِ راشد، مشمولہ: 'تیل کے سوداگر'، لاہور: ماورا پبلشرز، مارچ ۱۹۹۰ء، ص ۲۳۶۔
۳۔ ن م راشد، کُلّیاتِ راشد، مشمولہ: 'تیل کے سوداگر'، لاہور: ماورا پبلشرز، مارچ ۱۹۹۰ء، ص ۲۳۶۔
۴۔ ایضاً، ص ۲۳۶۔
۵۔ ن م راشد، کُلّیاتِ راشد، مشمولہ: 'تیل کے سوداگر'، لاہور: ماورا پبلشرز، مارچ ۱۹۹۰ء، ص ص ۲۳۶، ۲۳۷۔

۶۔ ایضاً، ص۲۳۷۔

۷۔ ن م راشد، کُلّیاتِ راشد، مشمولہ: 'تیل کے سوداگر'، لاہور: ماورا پبلشرز، مارچ ۱۹۹۰ء، ص ص۲۳۷۔

۸۔ ن ۔ م۔ راشد: فکرو فن، (مرتبین: مغنی تبسّم، شہر یار) ن۔ م۔ راشد کا ذہنی ارتقا، از خلیل الرحمٰن اعظمی مشمولہ (ن۔م۔راشد: فکرو فن)، حیدر آباد، مکتبۂ شعر و حکمت، فروری ۱۹۷۱ء، ص۵۸۔

۹۔ ن م راشد، کُلّیاتِ راشد، مشمولہ: 'تیل کے سوداگر'، لاہور: ماورا پبلشرز، مارچ ۱۹۹۰ء، ص ص۲۳۷، ۲۳۸۔

۱۰۔ ایضاً، ۲۳۸۔

۱۱۔ ن م راشد، کُلّیاتِ راشد، مشمولہ: 'تیل کے سوداگر'، لاہور: ماورا پبلشرز، مارچ ۱۹۹۰ء، ص ص۲۳۸۔

۱۲۔ ایضاً، ۲۳۸۔

۱۳۔ ن م راشد: شخصیت اور فن، (مرتبین: مغنی تبسّم، شہر یار)، مشمولہ: 'خلیل الرحمٰن اعظمی'، نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۱ء، ص۵۵۔

۱۴۔ ن م راشد، کُلّیاتِ راشد، مشمولہ: 'تیل کے سوداگر'، لاہور: ماورا پبلشرز، مارچ ۱۹۹۰ء، ص ص۲۳۸۔

۱۵۔ ایران میں اجنبی، ن م راشد۔ (مقدمہ: پطرس بخاری مشمولہ، ایران میں اجنبی)، گوشۂ ادب، چوک انار کلی، لاہور۔ ۱۹۵۷ء، ص۱۴۔

۱۶۔ مقالاتِ صفدر میر۔ صفدر میر، مکتبۂ عالیہ، لاہور۔ ۱۹۷۷ء۔ ص۸۳۔

۱۷۔ سویرا'' شمارہ ۴۳۔ نیا ادارہ، اُردو بازار، لاہور۔ ص۶۴۔

۱۸۔ اِس نظم میں، میراجی، مشمولہ: 'زنجیر'، کراچی: آج، سٹی بک پریس، ۲۰۰۲ء، ص ص۱۵۷، ۱۶۰۔

۱۹۔ ن م راشد، کُلّیاتِ راشد، مشمولہ: 'تعارف'، لاہور: ماورا پبلشرز، مارچ ۱۹۹۰ء، ص ص۲۹۵، ۲۹۶۔

۲۰۔ ن م راشد، کُلّیاتِ راشد، مشمولہ: 'تعارف'، لاہور: ماورا پبلشرز، مارچ ۱۹۹۰ء، ص۲۹۶۔

۲۱۔ ن م راشد، کُلّیاتِ راشد، مشمولہ: 'تعارف'، لاہور: ماورا پبلشرز، مارچ ۱۹۹۰ء، ص۲۹۶۔

۲۲۔ ایضاً، ۲۹۶۔

۲۳۔ ایضاً، ۲۹۶۔

۲۴۔ ن م راشد، کُلّیاتِ راشد، مشمولہ: 'تعارف'، لاہور: ماورا پبلشرز، مارچ ۱۹۹۰ء، ص۲۹۶۔

۲۵۔ ن ۔ م۔ راشد: فکروفن، (مرتبین: مغنی تبسّم، شہر یار) ن۔ م۔ راشد: انسان اور خُدا، از عالم خوند میری مشمولہ(ن۔م۔راشد:فکروفن)،حیدرآباد،مکتبۂ شعروحکمت،فروری۱۹۷۱ء،ص ص ۵۴،۵۵۔